

جمیل الدین عالی کے دوہوں کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of Jamiluddin Aali's Dohas

ڈاکٹر زینت بی بی اسسٹنٹ پروفیسر، شہید بینظیر بھٹو خواتین یونیورسٹی پشاور

Dr. Zeenat Bibi Email: drzeenatbibi@sbbwu.com
Assistant Professor, Shaheed Benazir Bhutto Woman
University Peshawar

ڈاکٹر محمد ناصر آفریدی اسسٹنٹ پروفیسر، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr. M Nasir Afridi Email: Nasirafri3388@gmail.com
Assistant Professor, Alhamd Islamic University, Islamabad

ڈاکٹر سید عون ساجد، اسسٹنٹ پروفیسر، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr. Syed Aoun Sajid Email: Dr.aounsajid@gmail.com
Assistant Professor, Federal Urdu University, Islam Abad

Received: 9-5-2022 **Accept:** 11-4-2022 **Online:** 28-6-2022

ABSTRACT:

Jamiluddin Ali is a well-known Urdu poet. His first collection of words was published in 1957 under the title "Ghazals, Doha, Geet". Seventeen (17) years after this collection, his second collection of poetry "Lahasil" was published. Apart from ghazals, songs and duets, Aali has also written national anthems. A collection of his has been published under the title "Jive Jive Pakistan". Aali has the honor of being the pioneer of Doha writing in modern times. Thanks to this, not only did Doha writing flourish as a genre, but also many new possibilities were opened for this genre.

KEYWORDS: Aesthetic taste, Duality, Passion, lyric Writing, Intensity of thought, Nature, Songwriting

شعری اصناف میں دوہا ایسی صنف سخن ہے جو ایک شعر پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے ہر مصرعے کے دو حصے ہوتے ہیں۔ جن کے درمیان میں وقفہ یا ٹھہراؤ لازمی ہوتا ہے۔ اس طرح پورے شعر کے چار حصے یا پھر دو (۲) درمیانی وقفے قرار پاتے ہیں۔ ان کے دوہوں میں مصرعے معنوی لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں۔ یہ دراصل غزل کے مطلع کی مانند ہوتا ہے۔ دوہا ہندی کی معروف صنف ہے۔ ہندی ادب کے علاوہ یہ کہیں اور نظر نہیں آتے۔ دوہا اپنی ذات

میں ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ یہ غزل کے اشعار کی طرح ایک لڑی میں پرو کر کوئی اور صنف نہیں بناتا۔ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم وزن ہوتے ہیں۔ اگرچہ اسے فردیائیت کے مترادف ٹھہرایا جاتا ہے لیکن غزل کا شعر یکسر مختلف ہوتا ہے:

"اردو اور فارسی میں غزل کے تمام اشعار جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن وہ اس غزل سے جس میں یہ شامل ہیں، یکسر بے نیاز بھی نہیں رہ سکتے وہ غزل کے مجموعی تاثر میں مدد و معاون ہوتے ہیں، لیکن دوہے، بزعم خود آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں۔"^(۱)

دوہے کو ہم اردو کے "بیت" کے مترادف کہہ سکتے ہیں۔ رباعی کا ہم پلہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ گویا یہ چار ٹکڑوں پر مبنی ایک ایسا شعر ہوتا ہے جس میں مکمل نفس مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ دوہا کی تعریف کے حوالے سے منصف خان صاحب صاحب لکھتے ہیں:

"دوہے کے دو مصرعے ہوتے ہیں۔ جو غزل کے مطلع کی طرح ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر کی طرح ہر دوہا بھی دو مصرعوں میں ایک مکمل نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوہے میں سادہ مقامی الفاظ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔"^(۲)

جدید دور میں دوہوں کے حوالے سے نمایاں ناموں میں میر جعفر زٹلی، نظیر اکبر آبادی، انشا اللہ خان انشاء، بہادر شاہ ظفر، پر تور و سید، بھگوانداس، قتیل شفائی، ندافاضلی، علی عابد پشوری، عرش صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، خواجہ دل محمد، مظفر حنفی، ظفر گورکھپوری، تاج سعید، یوسف جمال اور ابراہیم عشق، کشور ناہید اور جمیل الدین عالی وغیرہ جیسے نامور شعرا شامل ہیں۔ دوہوں کے حوالے سے پہلی کتاب جو پاکستان میں شائع ہوئی اس کتاب کا نام "پیت کی ریت" ہے۔ یہ کتاب خواجہ دل محمد نے لکھی ہے۔ زبان اور مضامین کے حوالے سے یہ ایک مکمل کتاب ہے۔

اردو میں دوہوں روایت اگرچہ ہندی سے آئی لیکن ان کے پیرائے بیان، صورت گری میں ہمیں ترکی فارسی اور اردو کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ ان دوہوں میں برصغیر کی تہذیبی روایات کے اثرات بھی جذب ہیں۔ دوہوں کے مطالعے کے نتیجے میں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہندی دوہوں کی روایت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور ان سے بلواسطہ یا بلاواسطہ متاثر رہے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان دوہوں کی خمیر میں دوسرے عناصر بھی شامل ہیں۔ یہاں تصوف کی بالواسطہ چاشنی بھی ہے خسرو و غالب کارنگ بھی۔

بعد میں جمیل الدین عالی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اردو کی کشادہ دلی کی وجہ سے عالی نے دوہوں کے لیے اردو کو منتخب کیا۔ ان کے دوہے اپنے مضامین، ترنم اور نغمگی کے باعث مقبول عام ہیں۔

ہندی شاعری سے مسلمان شعراء کے استفادے کی روایت اگرچہ پرانی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں تو اس میدان میں ہمیں خسرو، عبدالرحیم خان خاناں، فیضی، سید ابراہیم، قاسم شاہ اور دوسرے کئی مسلمان شعراء ملتے ہیں۔

اسی طرح جدید دور میں بھی مقبول احمد پوری، میراجی اور جمیل الدین عالی جیسے دوسرے کی شعراء تک یہ سلسلہ پہنچتا ہے۔ ہندی شاعری کی نمایاں جھلک ہمیں جمیل الدین عالی کے دوہوں میں ملتی ہے۔ جہاں تاریخی روایات اور ہندی الفاظ کی آمیزش کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ عالی کے دوہوں کی ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ جہاں ان میں برصغیر کی تہذیبی روایات ملتی ہیں۔ وہاں اپنے دور کے مسئلے مسائل سے ان کی شاعرانہ فکر غمگینی نظر آتی ہے۔ عالی نے ان دوہوں کے سلسلے میں جو رنگ قبول کیا وہ بڑی حد تک خسرو اور اس کے بعد کبیر سے قریب ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی اپنی انفرادیت قائم ہے:

سور، کبیر، بہاری، میرا، رحمن، تلسی داس

سب کی سیوا کی پر عالی گئی نہ من کی پیاس (۳)

جمیل الدین عالی نے سفر نامے، دیباچے، گیت اور دوہے لکھے ہیں۔ مگر بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔ خصوصاً دوہا نگاری میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کی نثر بھی ان کی شاعری کے مقابلے میں لائی جاسکتی ہے۔ دیباچہ نگاری ان کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ انہوں نے تقریباً سو سے زیادہ کتابوں کے دیباچے لکھے ہیں۔ ان دیباچوں میں ان کا تحقیقی نقطہ نظر واضح ہے۔ انہوں نے جن کتابوں کے دیباچے لکھے ہیں ان کا صرف سرسری جائزہ ہی نہیں لیا، بلکہ ان کو پڑھتے ہوئے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اس کتاب کو پڑھا بلکہ باقاعدہ ایک نقاد کی حیثیت سے پڑھا۔

پس منظر کے طور پر دیکھا جائے تو جمیل الدین عالی بیک وقت نثر نگار، شاعر اور سفر نامہ نگار ہیں۔ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ ان کا اصل میدان غزل نگاری ہے۔ یہ روایت ان کو غالب کے وسیلے سے ملی۔ موجودہ دور میں انہوں نے دوہا نگاری کی روایت کو زندہ رکھا ہوا ہے اور اسی میں ان کی انفرادیت بھی برقرار ہے۔ دوہا نگاری میں ان کے ہاں وہ تمام صفات موجود ہیں جو اعلیٰ اور پائیدار شاعری کے لیے لازمی تصور کی جاتی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مشاعروں کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ دیگر اصناف کے ساتھ جمیل الدین عالی کے دوہوں کو بھی مشاعروں میں پسندیدگی حاصل رہی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں عالی کے دوہوں کی وجہ سے یہ روایت جدید دور میں زندہ رہی ہے۔ ان کے دوہوں کو ہر سطح پر پذیرائی حاصل رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ باقاعدہ فرمائش کر کے مشاعروں میں ان کے دوہوں کو سنا جاتا رہا۔ اس طرح عالی نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے دوہوں کو اردو شاعری میں اعلیٰ مقام مقام دلایا۔

یہ عالی کی تخلیقی صلاحیتوں کا کمال ہے کہ جہاں ناصرف ان کے دوہوں کو اردو ادب میں نئے سرے سے روشناس کرایا بلکہ دوبانگاری میں ایک خاص مقام بنایا، اور اس کے دامن میں اتنی وسعت پیدا کی کہ جہاں ہر طرح کے مضامین کو کواکبیا جاسکے۔ اس حوالے سے شان الحق حق لکھتے ہیں:

"عالی جتنے بھی دوہے اردو کے لکھ جائیں غنیمت ہو گا انہوں نے موضوع کی اتنی راہیں اس ایک انوکھی صنف میں نکال لی ہیں کہ ان کے دم تک تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔" (۴)

دوہے کو بحیثیت فن اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمیل الدین عالی کا تعلق جس علاقے سے ہے، وہ کھڑی بولی کا علاقہ ہے، جہاں تہذیب و ثقافت ایک نمایاں روپ کی صورت میں موجود ہے۔ یہاں کے فنکاروں نے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ ان میں گیت، دوہے، چو بولے، کہروا، اور بھجن شامل ہیں۔

دوہا لکھنا دراصل عالی کا جنون تھا۔ انہوں نے اسے اردو ادب میں متعارف کرنے کی غرض سے لکھا۔ مگر ایسا لکھا کہ ان کا یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے شعرا نے بھی ان کی پیروی میں دوہے لکھے۔ ان کے پہلے دوہے سے دوبانگاری کے حوالے سے ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے:

دوہے کہت کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھی نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے (۵)

جمیل الدین عالی کے دوہے پڑھتے ہوئے سب سے زیادہ جو جذبہ ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتا ہے، وہ فطرت پسندی ہے۔ فطرت پسندی ویسے تو ایک جذبے کا نام ہے۔ فطرت کے حوالے سے ابتدائی تصورات ہمیں ارسطو مارکس، برونو اور جیمس وغیرہ کے ہاں بکثرت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ فطرت نگاری کے حوالے سے ورڈزور تھاور کولرج اور اقبال کا نام اہمیت رکھتا ہے۔

فطرت نگاری عالی کی شاعری میں اور بالخصوص دوہا نگاری میں عروج پر ہے۔ ان کے تقریباً ہر دوسرے دوہے میں مناظر فطرت اور فطرت سے لگاؤ کا جذبہ موجود ہے۔ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف انسانوں سے نہیں بلکہ فطرت سے بھی گہرا عشق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں کائنات کے لیے بے پناہ کشش موجود ہے۔ راست مشاہدہ ہو یا ان کی قوت متخیلہ ہمیں رنگین نظاروں، آبشاروں، وادیوں، پھلوں، پھولوں، ندیوں اور باغوں کی سیر کراتے نظر آتے ہیں۔ مناظر فطرت کے حوالے سے کئی الفاظ و تراکیب ان کی دوہوں کی زینت بنے ہوئے ہیں:

اودا، اودا بادل گہری کالی گھٹا بن جائے
اس کے دھرم میں فرق ہے جو اس موسم کو ٹھکرائے^(۶)

دوہا نگاری کے سلسلے میں یہ حقیقت ہے کہ ہندو شاعری اور روایات سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان کی شاعری خصوصاً دوہا نگاری میں ہندی تہذیب روایت کا نمایاں رنگ جھلکتا ہے۔ محبت کا جذبہ دیگر زبانوں کی طرح ہندی میں بھی ہمہ گیر حیثیت کا حامل ہے۔ جہاں انسانوں سے محبت کا درس دیا جاتا ہے۔ انسانوں سے ان کی محبت کا جہاں عملی نمونہ موجود ہے کہ انھوں نے وفات کے بعد اپنی آنکھیں وقف کر دی تھیں تاکہ کسی ضرورت مند کے کام میں لائی جاسکیں۔ جمیل الدین عالی کے دوہوں میں انسان سے محبت کا یہ درس جگہ جگہ موجود ہے۔ ان دوہوں میں جدید دور کے تقاضوں کے حوالے سے سماجی شعور کی بیداری بھی نظر آتی ہے۔

دوہا اس لحاظ سے بھی ایک منفرد صنف سخن ہے کہ اسے سروں سے گایا جاتا ہے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اگر گائیگی کی کے دوران اسے مناسب انداز میں پیش نہ کیا جائے تو معنی اور مطلب کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ترنم اور موسیقی عالمی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ انہیں ساری خوبصورتی موسیقی کے ساتھ سروں پہنا کر نظر آتی ہے، اور یہی پہلو ان کی شاعری خصوصاً دوہوں میں نظر آتا ہے۔ اس طرح ہمیں ان کے دوہوں میں فطرت، جذبوں اور کہکشاؤں کے رنگ نظر آتے ہیں۔ جمیل الدین عالی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف بہترین دوہے لکھے، بلکہ اسے مخصوص ترنم کے ساتھ اپنے سننے والوں کے سامنے پیش کیا اور داد وصول کی۔

جا کوئی کہہ دے عالی سے بس گائے جی بہلائے
جو سنگیت کا بھید کریدے خود بے سُر ہو جائے^(۷)

دوہے خاصی تعداد میں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ان دوہوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی دیگر شاعری کے مقابلے میں زیادہ دلاویز ہیں۔ ان میں زندگی سے متعلقات ملتی ہیں۔ نہایت جزئیات کے ساتھ انہوں نے انسانی رویوں، احساسات اور ان کی خواہشات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے دوہوں میں خیالات کی فراوانی ہے۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ زندگی سے قریب تر ہے۔ یہی اس کی پسندیدگی کی ایک بنیادی وجہ بھی ہے۔ عالی کے دوہوں کے بارے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"عالی کے دوہے تقلید ہی نہیں اپنی فضا کی پیداوار ہیں۔ ان میں افسردہ سی شہزادگی کی بوباس بھی ہے اور قلندر جوگیوں، فقیروں کی ترنگ بھی۔"^(۸)

عالی کے دوہے شعریت سے بھرپور ہیں۔ ان میں عالی کے خیالات اور ابہترین انداز میں اس کی پیشکش موجود ہے۔ جہاں جذبے اور تخیل کا خوبصورت انداز میں امتزاج موجود ہے۔ جسے پڑھتے ہوئے قاری کو اپنے دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان دوہوں میں جمیل الدین عالی کے مشاہدات، محسوسات اور تجربات کو کوشدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے جہاں زندگی اور متعلقات زندگی جلوہ گر ہیں۔ ان کے ہاں جذبہ اور فن دونوں موجود ہیں۔

یہ دوہے اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ یہ ناصرف عالی کے ذاتی معاملات، کیفیات اور مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہیں بلکہ اجتماعی مسائل، احساسات اور جذبات کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ زندگی کے تلخ تجربات پر ان کی نظر نہ صرف اپنے تک محدود ہے بلکہ وہ تمام انسانوں کے حوالے سے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اپنے ہی من کا رونا کیا، ہر من میں لگی ہے آگ
ساجن مل کر جدا نہ ہوں، اے سکی یہ کس کے بھاگ^(۹)

معاشرتی ناسودگی انسانی زندگی کو اجیرن بنا دیتی ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف شعرا کے ہاں ہم اس غیر ناہمواری کے خلاف ان کا رد عمل موجود ہے۔ عالی کے ہاں بھی اس کے خلاف ناصرف احساسات موجود ہیں بلکہ اس حوالے سے اظہار رائے کی بھی کاوشیں موجود ہیں۔ یہ معاشرتی شعور عالی کے دوہوں میں ایک اہم جذبے کے طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے جہاں انسان بنیادی ضرورت روٹی کے حوالے سے اپنے جذبات کو کو بیان کیا اور آفاقیت حاصل کی، یہی جذبہ عالی کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے انسان کی بنیادی ضرورت روٹی کی تلاش اور اس ضرورت کے حصول میں پیش آنے والے مشکلات کو نظر انداز نہیں کیا:

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے
عالی جیسے مہا کوئی بھی بابو جی کہلائے
روٹی جس کی بھینی خوشبو بنے ہزاروں راگ
نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ^(۱۰)

دوہوں کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس کا ثبوت عالی نے اپنے دوہا نگاری کے سلسلے میں جا بجا دیا ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں کیا نہوں نے جزئیات نگاری نہ کی ہو۔ انسانی رویوں اور جذباتوں کی خوبصورت انداز میں مصوری ان دوہوں کا خاصہ ہے۔ ان دوہوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کا تعلق براہ راست دل اور دماغ دونوں سے ہے۔ نہ صرف انسان وقتی طور پر ان سے محظوظ ہوتا ہے بلکہ انسان کے شعوری نظام کو بھی متحرک کرتا ہے اور وہ زندگی کے مختلف زاویوں کے بارے میں سوچنے لگ جاتا ہے۔

دوہوں کے حوالے سے جمیل الدین عالی کا اسلوب بھی اہم ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات کو سادگی اور بے ساختگی سے بیان کیا ہے۔ جہاں خیال کے اندر صفائی موجود ہے وہاں اظہار میں بھی انہوں نے سادہ الفاظ، تراکیب اور تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ اس طرح یہ دوہے ایک بھرپور تاثر لیے ہوئے ہیں۔

عالی کی شاعری چاہے وہ غزل نگاری ہو، گیت نگاری ہو یا پھر دوہا نگاری ان مقام متعین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دوہے ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ تمام موضوعات کا ان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض صورتوں میں کسی شاعر کی شاعری متعلقہ شاعر کی شخصیت سے آگے نکل جاتی ہے۔ اور کہیں شخصیت شاعری سے۔ مگر عالی کے ہاں ایسا بالکل نہیں ہے:

"کچھ شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کی شاعری ان کی شخصیت کو مسح کر دیتی ہے۔ اور اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جن کی شخصیت ان کی شاعری کو توڑ مروڑ توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ عالی کی شاعری ان کی شخصیت کا مکمل اظہار ہے نہ یہ آگے نہ پیچھے نہ تو شخصیت نے شاعری کو ٹھکرایا ہے نہ شاعری میں شخصیت کا گلا گھونٹا ہے۔"^(۱۱)

متناسب انداز میں جذبات کا اظہار شعر شاعری کی وقعت بڑھا دیتی ہے۔ زندگی میں مختلف جذبات کا شخصیت کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ خوشی، غمی، محرومی اور آسودگی کے جذبات کو مناسب انداز میں سامنے لانا کسی فنکار کا کمال ہوتا ہے۔ جو شاعری میں قبولیت عنصر کو بڑھاتا ہے۔ انہی سچے جذبات کا اظہار ہمیں جمیل الدین عالی کے دوہوں میں جا بجا ملتا ہے۔ وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

دریا دریا گھومے مانجھی پیٹ کی آگ بجھانے
پیٹ کی آگ میں جلنے والا کس کس کو پہچانے^(۱۲)

عالی کا سلسلہ نسب چونکہ غالب سے ملتا ہے اس کا ثبوت ان کی شاعری میں خصوصاً دوہوں میں نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان دوہوں میں جابجا ہندی عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جس سے ان کے کلام میں تازگی اور تنوع موجود ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی دوہے اردو زبان میں لکھے گئے ہیں لیکن عالی کے بعد دوہانگاری ایک نئے سمت کی جانب گامزن ہے۔

رنگارنگی بھی ان دوہوں کا ایک اہم جز ہے۔ جہاں ان کے بیان میں رنگارنگی ہے، وہاں اظہار بیان بھی اس رنگارنگی سے خالی نہیں۔ حسن و عشق کے بیان میں نہایت خوبصورتیے جذبات نگاری کرتے ہیں۔ اس دور ان کا طرز عمل بطور واعظ نہیں، بلکہ وہ زندگی کی رعنائیوں سے خود بھی مستفید ہوتے ہیں اور اپنے پڑھنے والے کو بھی فیض یاب کراتے ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ غزلوں اور گیتوں کے مقابلے میں ان کے دوہوں میں یہ رنگارنگی زیادہ ہے۔

جمیل الدین عالی کے دوہے اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جمالیاتی حس کو بہتر اظہار کے لیے وسیلہ بنایا ہے۔ اگرچہ ان کے دور میں اور شعراء کے ہاں بھی ہمیں یہ مشق ملتی ہے مگر جو شہرت عالی کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی:

تم کہو دوہا، تم کہو بیت اور تم کہو سستی چھند
نہیں مری ندی کا طوفان ناموں کا پابند^(۱۳)

بے ساختگی ان کے تقریباً تمام دوہوں کا اہم عنصر ہے۔ یہ ہمیں میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ چاہے وہ حسن و عشق کا بیان ہو، منظر کا بیان ہو، معاشی استحصال کی بات ہو یا انسانی رویوں کا ذکر ہو۔ وہ اپنے احساسات کا بیان بغیر کسی رکاوٹ کے احسن طریقے سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں۔ وہ غزلوں کی طرح دوہوں میں بھی براہ راست اور بے ساختہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ جہاں زندگی کی حقیقتیں بے نقاب ہوتی نظر آتی ہیں۔ دوہوں کے بیان میں وہ کسی کی پیروی نہیں کرتے بلکہ یہاں اندازِ بیاں ان کا اپنا ہے۔ جو ان کے ذاتی تجربے کا عکاس ہے۔

وہ مشاعروں میں بڑے شوق سے شرکت کرتے اور لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں ماہر تھے۔ ان کی شاعری کو جہاں دوسرے لوگ سراہتے وہاں جمیل الدین عالی اپنے کلام کی خود بھی ابھی تعریف کرتے نظر آتے ہیں ان کے ان کے دونوں میں ایسے کئی

مقام آتے ہیں جہاں کی ستائش کرتے مجھے نظر آتے ہیں اکثر اس گئے وقت کو یاد بھی کرتے نظر آتے ہیں:

دوہے کہنے اور پڑھنے کا ایسا طرز نکالا تھا
سننے والے سر دھنتے تھے اور پہروں پڑھواتے تھے
"غزلیں دوہے گیت" کی شہرت ملک سے باہر پھیلی تھی
ہندوستان سے آنے والے تحفوں میں لے جاتے تھے (۱۴)

اس کی کئی وجوہات بھی تھیں۔ ایک تو ان میں اظہار بیان کی صلاحیت موجود تھی،
اکثر مشاعروں میں ترنم انداز میں اپنا کلام پیش کرتے۔ ان کی قوتِ اظہار میں یہ طاقت موجود
تھی کہ وہ بیک وقت سننے والے کے دل و دماغ دونوں کو متوجہ کر لیتے تھے:
سامنے بیٹھی سندر ناریں آپ طلب بن جاتی تھیں
پرودوں میں سے فرمائش کے سو سو پرچے آتے تھے (۱۵)

عالی کے دوہوں میں انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں بیک وقت موجود ہے۔ وہ نہ
صرف اپنی بات کرتے ہیں اس کے پردے میں اجتماعی زندگی کو کو پیش کرتے ہیں۔ انسانی
محسوسات، جذبات اور رویوں کا اظہار اس فنکارانہ انداز کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس میں
اپنی کہانی نظر آتی ہے۔

دیگر جذبات کے علاوہ جذبہ حب الوطنی کو ان دوہوں میں جگہ جگہ محسوس کیا جا
سکتا ہے۔ وطن سے محبت کا اظہار نہایت مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ اپنی قوم کی بیداری کی
کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ذاتی مفادات کے پیچھے بھاگنے والے دانشوروں اور ادیبوں پر
سخت نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ ملک و ملت کی
خدمت کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ جب اقتدار کا وقت آتا ہے ان کا مقصد پورا ہوتے ہی وہ
اپنے قوم سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتے ہیں۔ اس طرح کمزور، غریب، مفلس و نادار اور
ضرورت مند کو کم پر سی کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے دوہوں میں جگہ جگہ سماج کی
حالت بیان کی گئی ہے:

اب مالی پھر سینچ رہے ہیں ایک نیا گلزار
اس گلزار کو دھیان سے رکھنا جان سمجھنا یار
اس گلزار کو جان سمجھنا اس پر آنچ نہ آئے
پھر کوئی تجھ سا، پھر کوئی مجھ سا، اس کو روند نہ پائے (۱۶)

عالی کے دوہوں کو پڑھنے کے بعد یہی کہا جاسکتا ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ دوہوں میں بھی موضوعاتی تبدیلی کے امکانات روشن ہیں۔ نئے موضوعات اور جدید اسلوب نیز ذخیرہ الفاظ کے نئے تجربات اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دوہانگاری کے میدان میں قدیم روایات کو سامنے رکھ کر جدید انداز میں برتا جاسکتا ہے۔ اس طرح زبان و بیان کی جدت کے ذریعے اس صنف میں مزید خصوصیات پیدا کی جاسکتی ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے شاعری کی مختلف اصناف غزل، نعت اور نوحہ وغیرہ دوہے کے وزن میں لکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دوہے قطع اور نظم میں بھی بطور نمونہ لکھے جاسکتے ہیں۔

نگاری کے سلسلے میں عالی کا نام اس لحاظ سے زندہ و تابندہ رہے گا کہ انہوں نے جدید دوہا نگاری کی بنیاد رکھی۔ ادب اور بالخصوص اردو ادب میں جمیل الدین عالی نے اس صنف سخن کو ایک اعلیٰ مقام دلایا۔ بعد میں کئی شعرا نے ان کی تقلید میں ان کے اسلوب اور انداز کو اپنا کر دوہانگاری کی۔

موجودہ دور میں بد قسمتی سے اردو ادب میں دوہانگاری زیادہ مقبول صنف نہیں ہے۔ ہمارے ہاں شاعری میں غزل کا رنگ تمام اصناف پر غالب ہے۔ یہاں دوسرے اصناف کا رنگ جمانا اتنا آسان نہیں، کیونکہ بڑے بڑے شعراء میدان غزل کے کھلاڑی ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ دوہے کا براہ راست اردو سے تعلق نہیں۔ البتہ امکان ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ اس صنف کو جمیل الدین عالی جیسے اعلیٰ مرتبت شعراء کی نسبت نصیب ہوئی ہے۔ یقیناً آنے والے وقت میں دوہا بھی اردو کے دیگر اصناف کی طرح ایک نمایاں صنف کے طور پر متعارف ہو جائے گا۔

حوالہ جات

- ۱۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، مضمون: جمیل الدین عالی فن اور شخصیت، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۶
- ۲۔ منصف خان سحاب، نگارستان، مکتبہ جمال اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۳۸۲
- ۳۔ جمیل الدین عالی، دوہے، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۴۷
- ۴۔ شان الحق حقی، مضمون: ارمغان عالی، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۶۳

- ۵۔ جمیل الدین عالی، دوہے، ص ۱۳
- ۶۔ ایضاً، ص ۴۱
- ۷۔ ایضاً، ص ۲۴
- ۸۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مثنوی: دوہے کی روایت، اردو بک سینٹر، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۲۷۰
- ۹۔ جمیل الدین عالی، دوہے، ص ۱۶
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۲۲
- ۱۱۔ محمد حسن عسکری، مثنوی: دوہے، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۶
- ۱۲۔ جمیل الدین عالی، دوہے، ص ۶۲
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳
- ۱۴۔ ایضاً، ص ۶۵
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۶۵
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۷۹